© rasailojaraid.com

سید سلیمان ندویؒ

بحیثیت ایک مورّخ

جناب سید ذوالفقار حسین صاحب بخاری ایم، اے۔ اسلامیہ کالج لائل پور

"تاریخ تو مولانا شبلی کے دسترخوان کی چٹنی تھی"[1] —— یہ ہیں وہ الفاظ جو سید صاحب نے علامہ شبلی کے بارے میں کہے۔ خود سید صاحب کی تحریروں کے متعلق بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے لیکن سید صاحب کی تاریخ دانی کی تفصیل میں جانے سے قبل علامہ شبلی کی تاریخ دانی کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے جاننا ضروری ہے، کیوں کہ سید سلیمان اُسی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے رہنما علامہ شبلی ہیں۔

سید صاحب نے خود اپنی تاریخی کتابوں یا مقالات میں اپنے نظریۂ تاریخ پر کوئی واضح روشنی نہیں ڈالی۔ بلکہ شبلی کے جانشین کی حیثیت سے ان کے فلسفۂ تاریخ ہی کو اپنایا ہے۔

شبلی نے اگرچہ کوئی باقاعدہ تاریخ کی کتاب نہیں لکھی، لیکن بقول مہدی افادی "تاریخ کے معلّمِ اوّل" وہی تھے۔ تاریخ میں شبلی کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے تاریخِ انسانی پر عموماً اور تاریخِ اسلامی پر خصوصاً ایک فلسفی کی حیثیت سے نظر ڈال کر ایک خاص فلسفۂ تاریخ وضع کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مشرق و مغرب کے تاریخی سرمایے کو کھنگالا ہے، ایک طرف اگر انھوں نے مسلمان علمائے تاریخ کے افکار سے فائدہ اٹھایا ہے تو دوسری طرف انھوں نے یورپ کے فضلائے تاریخ کے افکار کو پیشِ نظر رکھا ہے اور اس طرح انھوں نے ایک نئے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد رکھی ہے ہم یہاں ان کے چند افکار درج کرتے ہیں:-

---

[1] تذکرہ سلیمان ص ۶۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شبلی اس بات کے قائل ہیں کہ :-

"فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کئے ہیں اور انسان نے عالمِ فطرت پر جو اثر ڈالا ہے ان دونوں کے مجموعہ کا نام تاریخ ہے .... ان حالات اور واقعات کا پتہ لگانا جن سے یہ دریافت کیا جائے کہ موجودہ زمانہ گذشتہ زمانے سے کیوں کر بطور نتیجہ پیدا ہو گیا ہے"[1]

شبلی کے نزدیک تاریخ میں یہ بھی ضروری ہے کہ :-

"جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلم بند کئے جائیں"

اور یہ کہ "تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے"[2]۔

شبلی تاریخ پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ :-

"یہی ایک چیز ہے جو قومی فیلنگ اور قومی جوش کو زندہ رکھ سکتی ہے۔ اگر یہ نہیں تو قوم قوم نہیں ہے"[3]

سید صاحب شبلی کے نظریۂ تاریخ کی پوری متابعت کرتے ہیں۔ شبلی کی یوں تو کئی حیثیات ہیں مگر ان کا مخصوص فن صرف تاریخ اور کلام رہا۔ سید صاحب نے یہ رائے[4] علامہ شبلی کے بارے میں دی ہے ہم اس کا اطلاق بخوبی خود سید صاحب پر کرتے ہیں[5]۔ سید صاحب کی کوئی کتاب یا مقالہ دیکھ لیجئے آپ کو تاریخ یا کلام کا اثر قریباً ہر جگہ دکھائی دے گا۔ رشید احمد صدیقی صاحب شبلی و سید صاحب کا مقابلہ کرتے ہوئے سید صاحب کے تاریخی شغف کی طرف بھی بڑا واضح اشارہ کرتے ہیں۔

وہ رقم طراز ہیں :-

"..... شبلی کی طرح سید صاحب کو بھی تاریخ سے بڑا لگاؤ تھا۔ بہت زیادہ لگاؤ، کوئی مسئلہ ہو

---

[1] الفاروق جلد ۱ ص ۵۲۔ [2] دیباچہ المامون جلد اول ص ۳۔ [3] ایضاً ص ۵۳۔ [4] یادِ رفتگاں ص ۱۲۔

[5] ابو علی اعظمی صاحب لکھتے ہیں: "یوں تو سید صاحب نے ہر موضوع پر مضامین لکھے اور اس موضوع سے متعلق دادِ تحقیق دی، لیکن سید صاحب کا اصل ذوق تاریخ تھا" (برہان مئی ۱۹۶۰ء ص ۳۰۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سید صاحب اس کے موجود کو اس کے ماضی میں تلاش کئے بغیر پرکھے بغیر نہیں رہتے تھے۔

سید صاحب کی کسی قسم کی تحریر ہو تاریخ کے حوالے اس میں ضرور ملیں گے اور شاید یہ اسی کا فیضان تھا کہ واقعہ کچھ ہو، شخصیت کسی کی ہو، سید صاحب کا قلم اکثر بیشتر چلتا تھا اپنے ہی راستے پر اور اپنی ہی رفتار سے! جس میں ثابت قدمی اور ہمواری ملتی ہے۔"[1]

شبلی نے اپنی سوانح عمریوں کو پھیلا کر تاریخ کی حدود میں شامل کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ شعر العجم بھی ایک طرح سے تاریخ ہی کے زمرے میں داخل ہے۔ سید صاحب نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ ان کی سوانح عمریاں سیرتِ عائشہؓ، حیاتِ مالک۔ خیام۔ رحمتِ عالمؐ۔ اور حیاتِ شبلی صرف سوانح کی کتب ہی نہیں بلکہ اپنے اپنے دور کے رجحانات اور ماقبل کی تاریخ و واقعات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔ دیگر تاریخی کتب سے قطعِ نظر حیاتِ شبلی ہی کی سوانح عمری نہیں بلکہ اس میں تاریخِ اسلام اور پورب کے فکری رجحانات کی دو تین سو سال کی علمی و مذہبی تاریخ بھی آجاتی ہے۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:۔

"حیاتِ شبلی میں فاضل مؤلف نے ہماری تیس چالیس سال کی مکمل، علمی، ادبی اور مذہبی تاریخ جس طرح پیش کی ہے اور (یادش بخیر) دیارِ پورب کی کوئی سات سو سال کی علمی تاریخ لکھ دی ہے۔"[2]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:۔

"حیاتِ شبلی دیکھنے میں ایک نامور عالم کی شخصی سوانح ہے مگر حقیقتاً مسلمانوں کی ایک صدی کی دینی و علمی، تہذیبی اور فکری ارتقاء کی تاریخ ہے۔ جس کے بغیر مسلمانوں کے قومی اجتماع اور موجودہ دور کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس میں تقریباً تمام معاصر تحریکات اور اداروں کی سرگذشت بھی آگئی ہے۔"[3]

علامہ شبلی اور علامہ سلیمان کے ذہنی اشتراک اور طریقِ کار کی مشابہت کی وجہ سے دونوں کا موازنہ شاید

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ ص ۲۷۔ [2] شبلی نامہ طبعِ اوّل ص ۱۲۔ [3] روزنامہ قومی آواز لکھنؤ ۳۰ نومبر ۵۳ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے جا نہ ہوگا۔ سید صاحب شبلی سے زیادہ کامیاب مؤرخ ہیں، تاریخ نگاری میں وہ اسلوب کی بجائے امرِ واقع کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ علامہ شبلی کے نزدیک بھی اچھا مؤرخ وہی ہے جو انشاء پردازی پر توجہ کرنے کی بجائے واقعات کی صحت کا زیادہ خیال رکھے۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں :-

"درحقیقت تاریخ اور انشاء پردازی کی حدیں بالکل جدا جدا ہیں۔ ان دونوں میں جو فرق ہے وہ نقشہ اور تصویر کے فرق سے مشابہ ہے .... مؤرخ کا اصلی فرض ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کے حق سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ رنگینی کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس نے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا۔"[1]

شبلی تاریخ کو ادب سے زیادہ سائنس کا ایک جز تسلیم کرتے ہیں۔ مگر جب شبلی کی تاریخی کتابوں اور مقالوں کو دیکھتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ ان کی تاریخیں واقعات کی صحت سے زیادہ انشاء پردازی کا نمونہ ہیں وہ زیادہ تر تخیل اور اسلوب سے کام لیتے ہیں۔ وہ جذباتی ہیں اور اسلامی علوم و فنون سے بڑی محبت رکھتے ہیں، اس لئے اکثر اوقات جذبات کی رو میں بہہ کر تاریخ نگاری میں شاعری کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ شاعرانہ تخیل نے ان کی نثر کو تو بڑا ادبی مرتبہ دے دیا مگر اس کے ساتھ ان کی تاریخ دانی پر بھی زد پڑی، اور ان کے اندازِ نگارش نے ان کی تاریخی کتابوں و مقالات کی افادی حیثیت پر اثر ڈالا۔

اس کے برعکس سید صاحب واقعہ نگاری کا بہت خیال رکھتے ہیں، ان کی کتابوں میں بہت کم واقعات ایسے نظر آئیں گے جہاں انھوں نے حقیقت نگاری کو ترک کیا ہو۔ وہ تاریخی صداقت کو اولیت دیتے ہیں اور اسلوب کی حیثیت ان کے ہاں ثانوی معلوم ہوتی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں :-

"سید صاحب تاریخی دیانت و امانت کا اس درجہ لحاظ کرتے تھے کہ ان کو اپنی تصانیف میں شاعری کرنے کی بہت کم فرصت یا مواقع ملتے تھے۔"[2]

سید صاحب کی کتابوں میں "یادِ رفتگاں" میں سب سے زیادہ انشاء پردازی کی گنجائش تھی۔ سید صاحب کو مرنے والوں کی جدائی پر اپنے قلبی تاثرات کو صفحۂ قرطاس پر لانا تھا اس میں جذبات کی رو میں بہہ جانے، اور

---

[1] الفاروق جلد ۱ ص ۶۳ و ۶۴۔ [2] ہم نفسانِ رفتہ ص ۲۷۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انشاء پردازی کے پردوں پر پرواز کرنے کا موقع تھا، لیکن سید صاحب کا قلم یہاں بھی خاص حد سے آگے نہیں گیا۔

رشید احمد صدیقی صاحب انہی مضامین کے متعلق اپنا تاثر اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ان مضامین کے لکھنے میں سید صاحب بہت زیادہ احتیاط رکھتے تھے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے جہاں وہ مؤرخانہ حدود سے بے اختیارانہ تاثرات کے حدود میں چلے گئے ہیں"[1]

سید صاحب کی وہ کتابیں جنھیں تاریخی کتب کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے یہ ہیں:

(۱) تاریخ ارض القرآن۔ (۲) عرب و ہند کے تعلقات۔ (۳) عربوں کی جہاز رانی۔ (۴) حیاتِ شبلی۔ (۵) ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں۔ (۶) حیاتِ مالک۔ (۷) خیام۔ (۸) سیرتِ عائشہؓ۔ (۹) خطباتِ مدراس۔

تاریخی مقالات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے بعض مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہاں چند مشہور مقالات کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) حسین بن منصور کی تاریخی شخصیت۔ (۲) محمد بن واقدی۔ (۳) پھر واقدی۔ (۴) کتب خانہ اسکندریہ (۵) لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان[2]۔ (۶) تاج محل اور لال قلعہ کے معمار[3]۔ (۷) قنوج۔ (۸) عربوں کی بحری تصنیفات۔ (۹) اسماء الرجال کا قدیم ذخیرہ۔ (۱۰) خلفائے اسلام کا اقتدار۔ (۱۱) خلفائے راشدین کا طریقِ حکومت۔ (۱۲) ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی۔ (۱۳) رومن کیتھولک تاریخ کی من گھڑت کہانیاں۔

---

[1] ہم نفسانِ رفتہ۔ ص ۲۱۔ [2] سید صاحب کا یہ مقالہ ایک تاریخی شاہکار ہے۔ [3] عبدالرحمٰن چغتائی صاحب لکھتے ہیں:

"۱۹۳۱ء میں مولانا مولوی سید سلیمان ندوی نے جب بہ مقام لاہور "ادارۂ معارفِ اسلامیہ" میں اپنا بصیرت افروز مقالہ بہ عنوان "لاہور کا ایک معمار خاندان" پڑھا تو علمی و ادبی حلقوں میں اس کے متعلق کافی دل چسپی کا اظہار کیا گیا، اس مجلس میں سر عبدالقادر مرحوم، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال، حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم، سر سکندر حیات خاں مرحوم، ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم اور حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم موجود تھے .... مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مقالہ میں بڑے طمطراق سے معمارِ اعظم یعنی معمارِ تاج نادر العصر استاد احمد معمار لاہوری شاہ جہانی کے نام کا انکشاف کیا۔"

مجلّہ ماہِ نو کراچی استقلال نمبر اگست ۱۹۵۳ء ص ۴۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱۴) دیبل - (۱۵) عرب اور امریکہ - (۱۶) اسلامی رصد خانے [1] - (۱۷) برمک اور برمکہ - (۱۸) مرہٹوں کا فوجی نظم -

سید صاحب کے ہاں ان تاریخی کتب اور مقالات میں انشاء پردازی کے بجائے واقعات کی صحت کا خیال رکھا گیا ہے - ان کے ہاں صرف دو مقام ایسے آتے ہیں جب وہ احتیاط قائم نہیں رکھ سکے، ایک تو اس وقت وہ جذباتی ہو جاتے ہیں جب مستشرقین کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں جن میں ان لوگوں نے اسلام اور اہلِ اسلام پر بے جا حملے کئے ہیں - اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سید صاحب کا اندازِ جذباتی ہونے کے باوجود ان مواقع پر بھی تاریخی صداقت سے تجاوز نہیں کرتا - دوسرے جہاں وہ اپنے استاد کے بارے میں یا ان کی مدافعت میں لکھتے ہیں وہاں جذباتی لگاؤ کی وجہ سے اپنے قلم پر انہیں قابو نہیں رہتا [2] - مستشرقینِ یورپ کے بارے میں ان کی روش غیر شعوری طور پر شبلی کی خواہش کی تکمیل کی صورت ہے :-

"اگر دنیا کی عجیب و غریب غلط فہمیوں کی فہرست تیار کی جائے تو ان میں یورپ کے مؤرخین کی غلط بیانیوں کو سب سے اونچے درجے پر رکھنا پڑے گا اور اگر کوئی شخص ان غلط فہمیوں کو دور کرنا ہی اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار دے لے تو اس کے لئے یہ عمر کافی نہ ہوگی بلکہ اس کام کی تکمیل کے لئے اسے خدا سے ایک اور عمر کی دعا مانگنی پڑے گی -" [3]

تاہم ایسے مقامات خال خال ہیں جہاں ان کی انتہا پسندی نظر آتی ہو -

واقدی کے سلسلے میں انھوں نے جو مقالہ لکھا ہے اس میں ان کا لہجہ عام روش کے مقابلے میں قدرے

---

[1] سید صاحب نے یہ مضمون ابتدائی زمانے میں الندوہ کا میں لکھا تھا جو کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا اس مضمون کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھا انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا" (سید سلیمان ندوی ابو علی اعظمی ص ۱۶ مجلہ "نقش دیوبند" جولائی ص ۵۹)

[2] بعض لوگ اس صورتِ حال کو بھی جائز قرار دیتے ہیں مثلاً ڈوبرے (DOBREE) کا کہنا ہے :-

"......... A HISTORIAN WHO HAD NO PREJUDICES OR PASSIONS, NO INTELLECTUAL PREFERENCES WOULD BE A MONSTER AND HIS WORK WOULD PROBABLY BE UNREADABLE —" P.P 142.

پھر آگے چل کر ڈوبرے یہاں تک لکھ دیتا ہے :-

"WE DONOT ASK FOR OUR HISTORIANS TO BE DICTAPHONES; WE DEMAND THAT THEY SHOULD BE MEN, FOR UNLESS THEY COLOUR HISTORY FOR US WITH THEIR OWN PERSONALITIES, WE SHOULD NOT READ THEM HOWEVER REGRETTABLE THIS MAY SEEM" P.P. 146.

(MODERN ENGLISH PROSESTYLE)

[3] رسائلِ شبلی ص

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سخت ہے۔ شاید یہ کہ یورپ کے متعصب سیرت نگار مارگولیتھ کے حوالہ سے مانچسٹر گارڈین کے ایک عیسائی نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بہت سی غلط باتیں منسوب کردیں، مارگولیتھ نے یہ باتیں واقدی کے حوالے سے بیان کی تھیں۔ اس پر واقدی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے پر بحث چھڑ گئی۔ سید صاحب نے اپنے مقالے میں یہ ثابت کیا ہے کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو سے زیادہ نہیں، اور تاریخ وسیر کی کتابوں میں اس کا حوالہ دینا بڑی ناانصافی ہے[1]۔ مارگولیتھ کے علاوہ ڈاکٹر گولیم (جرمنی کے مستشرق) نے بھی اس بحث میں شرکت کی۔ سید صاحب نے ان دونوں کو اپنی تحقیق سے خاموش کردیا۔" ان مضامین کا بعد میں انگریزی اور عربی میں ترجمہ بھی ہوگیا[2]" دوسرا مقام جہاں سید صاحب جذبات کی رو میں بہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ وہ ہے جہاں اپنے استاد شبلی کا ذکر کرتے ہیں۔ حیاتِ شبلی میں اپنے استاد کی محبت اور عقیدت کی بناء پر ان سے بعض واقعات میں تسامح ہوگیا ہے۔

سید صاحب نے شبلی کی علمی حیثیت کی بہت زیادہ تعریف[3] کی ہے۔ حالانکہ ان کے معاصر علماء میں ان سے کہیں بڑھ کر صاحبِ علم وفضل اور صاحبِ تقویٰ[4] علمائے کرام موجود تھے۔ مثلاً مولانا رشید احمد گنگوہی رح مولانا سید احمد حسن محدث امروہوی۔ مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی، مفتی لطف اللہ علی گڈھی۔ مولانا محمود الحسن المعروف بہ شیخ الہند، مولانا شاہ سلیمان پھلواری، مفتی عزیز الرحمن عثمانی، مولانا عبدالحق حقانی مولانا اشرف علی تھانوی۔ اگر شاعرانہ نثر، بہترین اسلوب اور تاریخ وفلسفۂ تاریخ اور علم کلام کے لحاظ سے شبلی کا ان علمائے کرام سے مقابلہ کیا جائے تو شبلی کا پلّہ یقیناً بھاری رہتا ہے مگر حدیث[5]، فقہ، تفسیر اور تصوف[6] کے لحاظ سے ان کا پایہ شبلی سے بہت اونچا ہے، علمِ منطق میں تو مولانا حکیم برکات احمد کا مقام شبلی سے

---

[1] یہاں مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا ہے، مانا کہ واقدی زیادہ مستند نہیں مگر اتنے ناقابلِ اعتبار بھی نہیں، بحیثیتِ مؤرخ ان کا بھی ایک مقام ہے اور تاریخ وسیر کی کتابوں میں ان کا حوالہ ناگزیر ہے۔ [2] سید سلیمان ندوی' ابو علی اعظمی' نقش' اگست ۵۹ء ص ۳۲۔

[3] "دیباچہ حیاتِ شبلی" میں بھی مبالغہ آمیز حد تک ان کی علمی تفوق پر اظہارِ خیال کیا گیا مگر "یادِ رفتگاں" میں تو مبالغہ کی حد کردی ہے۔

[4] خود سید صاحب کو اعتراف ہے کہ شبلی میں تقویٰ وتقدس کی شدید کمی تھی۔ تفصیل ملاحظہ ہو۔ حیاتِ شبلی ص ۶۳۸۔

[5] علم حدیث کی تکمیل نہیں کرسکے تھے، سید صاحب نے اس کا خود اعتراف کیا ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو، حیاتِ شبلی ص ۸۵، ۸۶۔

[6] شبلی کے مزاج سے واقف حضرات سے یہ بات مخفی نہیں کہ ان کے ہاں احساسِ برتری وکمال کی فراوانی ہے۔ احساسِ کمتری یا کسرِ نفسی کی پرچھائیوں سے وہ اپنے دامن کو محفوظ رکھنے کی بہت کوشش کرتے ہیں لیکن تصوف کے بارے میں ان کا یہ کہنا کہ "تصوف کے عنوان کو میں نے بہت مختصر لکھا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کوچہ سے بالکل نابلد ہوں۔" مبنی برحقیقت ہے۔

(سوانح مولانائے روم ص ۱۹۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہیں زیادہ بلند ہے، اسی طرح شبلی کو عہدِ جدید کا معلّمِ اوّل قرار دینا بھی محلِ نظر ہے، سید صاحب کا یہ فرمانا کہ "علماء میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے وقت کی سیاسی باتوں میں دل چسپی لی، کانگریس کی حمایت کی، ہندو مسلم سیاسی مصالحت پر مضامین لکھے"[1] یہ بھی تاریخی صداقت سے بمراحل دور ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جنگِ آزادی اوّل ۱۸۵۷ء میں اور پھر اس کی ناکامی کے بعد حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی قدس اللہ سرہٗ اور ان کے رفقائے کرام نے جنگِ حریت میں حصّہ لیا اور جب دسمبر ۱۸۸۵ء[2] میں کانگریس کی بنیاد پڑی تو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اس کی حمایت میں فتویٰ دیا۔ اسی طرح کانگریس کی بنیاد کے قریبی زمانے میں مولانا عبد العزیز لقشبندی مجدّدی نے اس کی پُرزور حمایت کی۔[3] ۱۸۹۰ء میں تو علماء کا ایک جمِ غفیر کانگریس کی حمایت میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کی حمایت میں دنیائے اسلام کے جیّد علماء کے فتاویٰ بھی حاصل کر لئے جو اسی زمانے میں "نصرۃ الابرار" کے نام سے شائع ہو گئے۔[4] کانگریس کے قیام سے پہلے ہی یعنی ۱۸۷۸ء میں مولانا محمود الحسن صاحب کی جماعت "ثمرۃ التربیت" کے نام سے سیاسی کام کرتی رہی۔[5] مگر اس کی رفتار سست رہی، اسی طرح مولانا عبد القیوم صاحب ۱۹۰۵ء میں میدان میں آچکے تھے[6] اور کانگریس کی تحریر و تقریر سے حمایت کرنے لگے تھے۔ قیامِ کانگریس کے وقت اور اس کے کچھ سالوں بعد تک شبلی کی اوّل تو اس زمانے میں عمر بھی کم تھی، دوسرے علماء میں ان کے علم و فضل کا کوئی خاص چرچا بھی نہ تھا اور جب علی گڈھ کے قیام کے بعد وہ حیدرآباد تشریف لے گئے تو وہاں سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش رہے۔ حیدرآباد میں قیام ۱۹۰۵ء کے شروع تک رہا۔ طبقۂ علماء میں ان کی مقبولیت تو آخر تک نہ ہو سکی تھی، ان کے وقار کا اس سے ثبوت مل جاتا ہے کہ وہ ندوہ کی بساط پر شکست کھا جاتے ہیں، علماءِ دیوبند بھی ان سے زیادہ خوش نہیں تھے، شبلی کا سیاست میں اگر کوئی کارنامہ قابلِ ذکر ہے تو یہ ہے کہ وہ سیاست میں عملی حصّہ تو نہیں لیتے بس کتب خانے میں بیٹھ کر کوئی مضمون یا کوئی نظم لکھ دیتے ہیں "بیچ کھیت" شاید ہی انھوں نے کوئی صدائے احتجاج بلند کی ہو۔[7]

---

[1] حیاتِ شبلی ص۹۰۔ [2] "مسلمانوں کا روشن مستقبل" مرتبہ سید طفیل احمد بار پنجم ۱۹۴۵ء ص ۲۵۷۔ [3] تفصیل ملاحظہ ہو: "علماءِ حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے" حصہ اول، مرتبہ مولانا سید محمد میاں طبع اول ص۹۲ تا ص۱۰۷۔ [4] نصرۃ الابرار مرتبہ مولانا عبد القادر لدھیانوی و مولانا محمد صاحب لدھیانوی، تفصیل ملاحظہ ہو، مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۲۹۳۔ نصرۃ الابرار دوبارہ حافظ مشتاق احمد لدھیانوی نے ۱۹۴۵ء میں شائع کی (علماءِ حق ص ۱۰۳) [5] علماءِ حق ص۱۱۲ مولانا محمود الحسن نے دوبارہ ۱۹۰۹ء میں ایک دوسری جماعت جمعیۃ الانصار کے نام سے قائم کی، یہ بھی محض علماء پر مشتمل تھی اس کے مقاصد بھی قریباً سیاسی تھے (علماءِ حق ص ۱۳۰) [6] ذکرِ شبلی ص۲۳۔ [7] سید صاحب آگے چل کر ایک جگہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ "مولانا نے کبھی سیاست کے عملی کوچہ میں قدم نہیں رکھا" (حیاتِ شبلی ص۲۹۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محمد امین زبیری صاحب نے حیاتِ شبلی پر ایک مؤرخ کے نقطۂ نظر سے اعتراضات کئے ہیں، جن میں پانچ ایسے ہیں جن کا انھوں نے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) سید صاحب نے سرسید، چراغ علی اور مولوی کرامت علی جونپوری کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ باقاعدہ عالم نہ تھے، امین زبیری صاحب نے لکھا ہے کہ ان حضرات کی تعلیم شبلی سے کسی طرح کم نہ تھی، چراغ علی تو باقاعدہ عالم تھے اور کئی زبانوں کے ماہر تھے، اور یہ کہ مولوی کرامت علی کا میدان سراسر دوسرا تھا۔ سرسید اس سلسلے میں شامل نہ تھے جن میں سید صاحب شامل کر رہے ہیں (۲) سید صاحب نے سائنس کے دور کو مستشرقین کے دور سے مقدم کر دیا حالانکہ پہلے مستشرقین کا دور ہے اور پھر سائنس کا۔ (۳) ایک اعتراض یہ کیا کہ سید صاحب نے سرسید، چراغ علی اور مولوی کرامت علی جونپوری کا تو نام لیا مگر آنریبل سید امیر علی کا نام بالکل ترک کر دیا۔ اسی طرح یہ بھی کہا کہ شبلی پہلے شخص نہ تھے جنھوں نے اپنے زمانے کی سیاسی باتوں میں دلچسپی لی۔ سید صاحب نے شبلی کے سفرنامہ لکھنے کے تذبذب میں آٹھ نئے اسباب تخلیق کئے ہیں۔ زبیری صاحب نے ان سب کی تغلیط کی ہے، ان میں سے تاریخی طور پر دو اعتراض اہم ہیں۔ سید صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۸۹۶ء میں روم و یونان کی جنگ ہوئی، حالانکہ اس سنہ میں کوئی جنگ نہیں ہوئی بلکہ ۱۸۹۷ء میں ہوئی۔ سید صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ (یعنی شبلی) ہندوستان اور ترکی کے درمیان تعلقات کی پہلی کڑی تھے، اور مولانا اسلامی ہندوستان کے پہلے سفیر تھے جو ترکی گئے، زبیری صاحب نے ہر دو باتوں کو غلط قرار دیا اور بتایا کہ "اسی قریب زمانے میں مدراس کے عمدۃ التجار حاجی محمد عبدالعزیز بادشاہ مدراس صوبہ میں دولتِ عثمانیہ کے سفیر مقرر ہوئے تھے۔ متعدد اصحاب ترکی کا سفر کر چکے تھے، انہی میں سرسید کے ایک رفیق حاجی محمد اسمٰعیل خاں شروانی علی گڈھ نے ۱۸۸۲ء میں عرب ترکی اور یورپ کی سیاحت کی اور اپنا سفرنامہ شائع کیا۔

سرسالار جنگ ثانی نے بھی سیاحت کی۔ سلطان سے ملاقات ہوئی...... اور پھر انگلستان آکر مسئلہ مشرق اور مسئلہ ترکی پر مضامین شائع کئے۔ ۱۸۸۸ء میں نواب محسن الملک نے جب انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر گلیڈ اسٹون سے ملاقات کی تو جو گفتگو ہوئی اس میں ترکی کے متعلق جنگِ کریمیا ۱۸۵۶ء کی پالیسی کو دہراتے رہنے کو ملتِ اسلامیہ کا مدعا بتایا۔ اس گفتگو پر لندن ٹائمز نے جو تبصرہ کیا اس میں بھی اس مسئلہ پر بحث کی۔ اسی طرح وقار الملک کے صاحبزادے اور خادم التعلیم پریس لاہور اور مولانا خلیل احمد پروفیسر علی گڈھ نے ہند ترکی تعلقات کے روابط کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلسلے میں جو مساعی کی ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔ ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ سید صاحب نے زبیری صاحب کو نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کا لٹریری سکریٹری لکھا ہے[1]۔ زبیری صاحب لکھتے ہیں کہ "لٹریری سکریٹری کا نہ تو کوئی عہدہ ریاست میں تھا اور نہ راقم اس عہدہ پر مامور تھا"[2]۔

ان چند در چند خامیوں کے باوصف حیاتِ شبلی سید صاحب کی تاریخی بصیرت کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ شیخ محمد اکرام نے کچھ ایسا غلط نہیں لکھا جب وہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔ "ہم نے شبلی کے متعلق قریب قریب سارا قابلِ حصول تحریری مواد دیکھا ہے اور دستِ طلب دور دور تک پھیلایا ہے لیکن سید سلیمان کی کتاب میں شبلی کے واقعاتِ زندگی کو جس تاریخی تسلسل اور تفصیل سے ترتیب دیا گیا ہے اس نے ہمیں بہت سی زحمتِ غیر ضروری سے بچا لیا"[3]۔

تاریخی لحاظ سے سید صاحب کے دو بڑے کارنامے "عرب و ہند کے تعلقات" اور "عربوں کی جہازرانی" ہیں۔ "عربوں کی جہازرانی" پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے "استدراک" کی شکل میں تبصرہ کیا ہے۔ اس میں خوبیوں

---

[1] حیاتِ شبلی ص ۵، ۷۔ [2] ہم نے ذکرِ شبلی سے یہ چند اہم اعتراضات بطور تلخیص یہاں نقل کر دیئے ہیں، دیکھئے ص ۱۴ تا ص ۱۱۸۔ امین زبیری صاحب نے اپنے ایک اور مضمون میں "حیاتِ شبلی" میں تاریخی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ سب سے اہم یہ ہے کہ سید صاحب نے حیاتِ شبلی ص ۵۸۷ پر آرمینیا ۹۶-۱۸۹۵ء کے مسئلہ پر شبلی کے رول پر کچھ لکھا ہے۔ سید صاحب کے الفاظ یہ ہیں:۔ "اس سلسلہ میں یورپ کا ایک ایک اخبار طرح طرح کی دروغ بافی کر کے دنیا کی نگاہ میں ترکوں کو ملزم ٹھہرا رہا تھا"۔

امین زبیری صاحب نے مقالاتِ شبلی جلد ہشتم سے خود شبلی کے بیان سے یہ واضح کیا ہے کہ شبلی یورپ کے ایک ایک اخبار کو نہیں بلکہ صرف انگریزی اخبارات کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں (تفصیل ملاحظہ ہو حیاتِ شبلی میں مسخ حقیقت "نگار" مئی ۱۹۶۶ء ص ۴۰)

چند مقام ایسے بھی حیاتِ شبلی میں نظر آتے ہیں جہاں سید صاحب استاد سے لگاؤ کے باوجود مؤرخ کی حق گوئی کو خیرباد نہیں کہتے ہیں مثلاً:

(۱) الغزالی، سوانح مولانائے روم، علم الکلام اور الکلام کے متعلق اس طرح تنقید کرتے ہیں: "مگر ان کتابوں میں دو قسم کی کمیاں محسوس ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جدید علم و مسائل سے اُن کی واقفیت محض سنی سنائی سی تھی یا درجہ کی تھی۔ اس لئے وہ ان مقامات کی پوری تحدید نہ کر سکے، جہاں سے اسلامی مسائل پر زد پڑتی ہے۔ دوسری کمی یہ ہوئی کہ انھوں نے اسلام کے صحیح عقائد کو متکلمین و حکمائے اسلام کی کتابوں سے سن کر یکجا کیا کیونکہ ان کا سرچشمۂ اصلی کتاب الٰہی اور سنتِ نبوی تھی، اگر یہ دونوں چیزیں براہِ راست سامنے رکھی جاتیں تو منزلِ مقصود کا صحیح پتہ لگ جاتا" (دیباچہ حیاتِ شبلی ۲۲)

(۲) الغزالی میں شبلی کے سہوِ قلم سے ایک غلط حوالے کی نشاندہی کی ہے (حاشیہ دیباچہ حیاتِ شبلی ص ۲۵) (۳) علم الکلام اور الکلام کے متعلق لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اشاعرہ کا رد ہے، حالانکہ یہ معتزلہ کی حجت میں نہیں بلکہ ماتریدیہ کی محبت میں ہے۔ البتہ ان کا قصور یہ ہے کہ وہ اس مخالفت میں بھی اپنی کلامی تصنیفات میں اشاعرہ کے چکر سے نہیں نکل سکے" (حیاتِ شبلی ص ۸۲۸، ۸۲۹)۔

(۴) الفاروق کے متعلق لکھتے ہیں ۱۹۴۲ء میں اس طرح کی ہے:۔ "یہ مکمل نہیں اس میں تو صرف سیاسی پہلو کو نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے جس وقت یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت سیاسیات کا دور دورہ تھا اگر یہی کتاب آج لکھی جاتی تو حضرت عمر فاروق رض کے معاشی تدبر و تنظیم کو زیادہ اجاگر کر کے دکھایا جاتا کیوں کہ اب کمیونزم کا عروج ہے" (تذکرۂ سلیمان ص ۳۸) [3] شبلی نامہ ص ۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ کچھ خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کا کہنا ہے کہ سید صاحب نے تین چار متعلقہ کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی بڑا اعتراض نہیں ہے، ایک انسان کے لئے اگر یہ ناممکن نہیں تو اتنا ضروری بھی نہیں کہ وہ ہر ماخذ کا ذکر کرے۔ البتہ ان کے دوسرے اعتراضات بڑے وزنی ہیں، ایک یہ کہ سید صاحب نے قسطنطنیہ کے سلسلے میں مسلمانوں کے ابتدائی حملوں میں استنبول پر حملوں کا ذکر نہیں کیا حالانکہ حضرت معاویہؓ کے عہد کے حملے کا مشہور واقعہ حضرت ایوب انصاریؓ کی شہادت ہے اور ان کا وہاں مزار ہے۔ عبد الملک بن مروان کے لڑکے مسلمہ کا حملہ بھی قابلِ ذکر تھا۔ دوسرے یہ کہ سید صاحب نے جہازرانوں کا ذکر کرتے ہوئے عربوں اور ترکوں وغیرہ کا ذکر تو کیا مگر ہندوستان کے جہازرانوں کا ذکر بالکل نہیں کیا حالانکہ ملیبار میں پرتگالی حملوں کے زمانے میں کالیکٹ پر سامری لقب کے ڈوراجے حکمراں تھے، ان کی بڑی فوج میں مسلمانوں کی کافی تعداد تھی مگر ان کا بحریہ تو خالص اسلامی تھا ...... اور یہ کہ کنج علی مرکار کا خاندان موروثی طور پر سامری کا امیر البحر تھا۔[1]

خطباتِ مدراس میں تیسرا باب سید صاحب کی تاریخ دانی کا شاہکار ہے۔ اس میں سیرتِ محمدیؐ کے تاریخی پہلو کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔

سید صاحب کی غلطیاں وہ ہیں جن سے کوئی مؤرخ بھی شاید ہی خالی نظر آئے۔ جزئی باتوں میں اس طرح کی لغزشیں ممکن ہیں لیکن ان کے مقابلے میں بڑے بڑے تاریخی واقعات میں سید صاحب کی کارگذاری کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ علماء اور انگریزی داں طبقے میں ان کی علمی و تاریخی بصیرت کا اکثر اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ سب سے پہلا ثبوت تو اس وقت ملتا ہے جب کہ ہندوستان کی طرف سے ۱۹۲۰ء میں وفدِ خلافت لندن روانہ ہوا تو اراکینِ وفد نے سید صاحب کے ذمے جو کام لگائے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مذہبی اور تاریخی حیثیت سے انگریزی اخباروں میں وفدِ خلافت کے خلاف جو مضامین نکلیں ان کا جواب لکھا جائے۔[2]

علمائے کرام کی نگاہ میں سید صاحب کی شہرت زیادہ تر مؤرخ ہی کی وجہ سے تھی۔[3]

---

[1] تفصیل ملاحظہ ہو "عربوں کی جہازرانی" پر استدراک" (معارف مئی و جون ۱۹۳۶ء) [2] برید فرنگ ص۱۱۔

[3] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ سید صاحب کی جامعیت علم کے قائل ہیں۔ مگر وہ اعتراف کرتے ہیں کہ سید صاحب، علماء کے طبقے میں ایک مؤرخ ہی کی حیثیت سے متعارف تھے۔ قومی آواز ۳۰ر نومبر ۱۹۵۳ء۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب لکھتے ہیں:-

"دوسرے علوم و فنون میں سید صاحب کی جامعیت کے علاوہ یہ کہا جاتا تھا کہ تاریخ اسلام پر دنیا کے سب سے بڑے عالم یہی تھے، میں نے سید صاحب کے متعلق یہ تعریف مصر، عراق، حجاز اور شام میں بھی سنی اور ہندوستان و پاکستان کے اہلِ علم و نظر سے بھی"[1]

یہ حقیقت بھی ہے کہ سید صاحب طبقہ علماء میں ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جسے بلا تکلف محققین، مؤرخین اور مستشرقین یورپ و امریکہ ایشیا کے مقابل لایا جا سکتا تھا۔ ان سے تنہا ٹکر لینے کی سکت رکھتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے ٹکر لینے کی کامیاب کوشش بھی کی۔[2]

انگریزی داں طبقے نے ان کی تاریخ دانی کا اعتراف اس صورت میں کیا کہ انہیں تقسیم سے قبل آل انڈیا ہسٹری کانگریس کا رکن نامزد کیا۔ تقسیم کے بعد آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کا رکن مقرر کیا۔ آپ ان سوسائٹیوں کے سالانہ اجلاس کی صدارت بھی کرتے رہے ہیں۔[3] انفرادی طور پر انگریزی داں طبقے نے جس جس طرح سید صاحب کی تاریخ دانی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اس کا اندازہ چند حضرات کی آراء سے ہو سکتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی تحریر کرتے ہیں:-

"دنیا کو مسلّم ہے کہ وہ فنِ تاریخ میں امامِ وقت تھے۔"

ڈاکٹر سید اعجاز حسین لکھتے ہیں:-

"شبلی کی طرح آپ کو بھی تاریخ سے خاص شغف ہے جس کی وجہ سے وہ اسلام کے سیاسی اور ادبی کارناموں پر نہایت خوبی کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں جس سے گمنامی اور غلط فہمی کی تاریک گھاٹیوں

---

[1] سید صاحب کی یاد۔ ریاض سید سلیمان ندوی نمبر ص ۳۶ - سید صاحب کے ایک عقیدت مند لکھتے ہیں:-
"سید صاحب چاہے جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن وقت کے سب سے بڑے مؤرخ ضرور تھے۔" فاران" کراچی ستمبر سنہ ۱۹۵۸ء ص ۱۸۔

[2] سید صاحب کے تاریخی ذوق کا پتہ ہمیں ان کے ابتدائے تصنیفی زمانہ سے ہی مل جاتا ہے۔ علامہ شبلی بھی ان کی تاریخی بصیرت کے قائل تھے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ مصر کے مشہور عیسائی ادیب و صحافی جرجی زیدان مدیر "الہلال" کی تنقیدوں کے جواب میں علامہ شبلی نے "الندوہ" میں عربی میں ایک مبسوط سلسلۂ مقالات شروع کیا تھا، اس میں اس کے اعتراضات کا مسکت جواب دیا تھا۔ اس کے لکھنے میں سید صاحب نے استاد کی بھرپور قلمی معاونت کی تھی۔ بلکہ ایک مختصر سا باب جو بنو امیہ کی علمی سرپرستی پر ہے وہ سید صاحب ہی کے موقلم کا نتیجہ ہے۔ یہ طویل مقالہ بعد میں "الانتقاد علے التمدن الاسلامی" کے نام سے کتابی صورت میں طبع ہو گیا تھا۔ [3] معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے واقعات نکل کر حقیقت کی سطح پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔[1]"

پروفیسر ادیب رقم طراز ہیں:۔

"تاریخ ان کا مخصوص فن ہے اس لئے، جس موضوع کو لیتے ہیں اس پر تاریخی نظر ضرور ڈالتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے مقالوں کے متین، مدلل اور پُراز معلومات ہونے کا بڑا سبب یہی ہے، تاریخ کا فطری ذوق ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر بات کے اسباب کا کھوج لگائیں مختلف پہلوؤں کو دیکھیں۔ تعلقات کی چھان بین کریں، اس کا رنگ روپ دیکھیں، اسکی تہ تک پہنچیں، نتائج کا استنباط کریں، اور رموز و نکات نکالیں۔[2]"

ڈاکٹر سید معین الحق رقم زد ہیں:۔

"HE WAS UNDOUBTEDLY ONE OF THE GREATEST HISTORIANS OF THE PRESENT CENTURY AND AS SUCH HIS DEATH IS ALMOST AN IRREPARABLE LOSS TO THE CAUSE OF HISTORICAL RESEARCH IN THIS COUNTRY".[3]

---

[1] مختصر تاریخ ادب ص ۲۲۵۔ [2] معارف اپریل ۵۶ء ص ۲۴۸ - ۲۴۹۔

[3] PREFACE TO "THE PROCEEDINGS OF ALL PAKISTAN HISTORY CONFERENCE" HELD AT DACCA, 1953, PRINTED IN 1955.

ڈاکٹر سید معین الحق کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ "سید صاحب موجودہ صدی کے عظیم مؤرخین میں سے ایک ہیں، اور ان کی وفات اس ملک میں مورخانہ تحقیق کے مقاصد کے پیشِ نظر تقریباً ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔"

مقدمہ روداد "آل پاکستان تاریخی کانفرنس" منعقدہ ڈھاکہ ۱۹۵۳ء مطبوعہ ۵۵ء

غلام محمد صاحب نے کراچی کے ایک پروفیسر صاحب کی سید صاحب کے ساتھ ایک ملاقات کا حال لکھا ہے، اس سے مزید ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے نزدیک ان کا بحیثیت ایک مؤرخ کیا مقام تھا۔ پروفیسر موصوف کا خاص موضوع "فلسفۂ تاریخ اسلام" تھا........ سید صاحب سے تصدیقی تحریر کے خواہاں تھے۔ سید صاحب نے ان کا کچھ امتحان لیا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر بحث کا رُخ اس موضوع کی طرف پھر گیا کہ اسلام میں غیر اسلامی عناصر کہاں کہاں سے اور کب داخل ہوئے۔ سید صاحب نے فلسفۂ یونان سے لے کر دورِ حاضر کے فلسفۂ تاریخ کا ارتقاء کچھ اس انداز میں بیان فرمایا گویا وہ پہلے ہی سے تیاری کر آئے تھے۔

(تذکرۂ سلیمان ص ۲۵۸)

© rasailojaraid.com